# میر تقی میرؔ کی شاعری کا منظر نامہ

ڈاکٹر محمد ناصر آفریدی

Dr. Muhammad Nasir Afridi

Department of Urdu,

KPK Sarhad University, Peshawar.

ڈاکٹر تحسین بی بی

Dr. Tehseen Bibi

Chairperson, Department of Urud,

University of Swabi, Swabi.

***Abstract:***

*Meer Taqi Meer continued facing atrocities, problems and abominations of this world throughout his life. This is why, he expressed these all things in his poetry at large. Moreover, these problems and atrocities also added flavor to his poetry. In this article, the background study of his poetry is presented.*

دنیائے اُردو ادب میں میر تقی میر ایسے نابغۂ روزگار شاعر صدیوں میں کہیں ایک بار جنم لینے والے تھے۔ میر کو خدائے سخن، سرتاج شعرائے سخن، غزل کا بادشاہ، امام المتغزلین اور اُردو غزل کی آبرو ایسے القابات سے نوازا گیا ہے۔ اُنھوں نے غزل کے جدید طرزِ احساس کے ایسے پیکر تراشے ہیں کہ اُن کی غزل اپنے عہد کا مکمل منظر نامہ پیش کرنے کے باوجود ہر زمانے کے کرب اور احساس کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے۔ یہ کہنا مبنی بر حقیقت ہے کہ میر خود غزل کی پہچان بن چکے ہیں۔ میرؔ نے فکری اور فنی حوالوں سے شعر و ادب کی دنیا میں ایسا انقلاب رونما کیا ہے، جس کی بازگشت آنے والے زمانوں میں بھی انفرادیت سے سنائی دے گی۔ اُنھوں نے اُردو غزل اور مثنوی پر ہمہ گیر اور ہمہ جہت اثرات مرتب کیے ہیں۔ میر کا یہ اعجاز ہے کہ اُن کو ہر آنے والے شاعر نے مقدور بھر شعری خراج پیش کیا ہے۔ اُن کی غزل کی آنے والے وقتوں میں بازیافت ہوتی رہے گی۔ اُنھوں نے حسی سطح پر غزل کی امتزاجی کیفیت کو الگ طرزِ احساس اور فکری جہات عطا کی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میر کی غزل کا منظر نامہ زمان و مکان کی حدود سے ماورا ہوتے ہوئے بھی شان دار ماضی رکھتا ہے۔ میرؔ کی شاعری کی جڑیں اپنے عہد کی تہذیبی زندگی میں پیوست ہیں، جس میں روایت کا جاہ و جلال اور زوال آشنائی کا المیہ ہے۔ میر کے عہد کا پس منظر، خاندانی حالات، تعلیم و تربیت اور سیاسی منظر نامے نے اُن کے فن پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ میر نے الفاظ و تراکیب کے انتخاب سے لے کر اوزان و بحور کے تجربات تک فنی اور اسلوبیاتی حوالے سے اپنے شعری نظام کو نئی جہات کا آئینہ دار بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی غزل کو تہذیبی قدروں میں آمیخت اور متشکل کرنے میں کامران رہے ہیں۔ میر کا یہ کمال ہے کہ انھوں نے خود کو مقامیت کے دھارے سے آزاد

کراتے ہوئے اپنی صناعی اور تخلیقیت سے آفاقیت کا علم بردار بنادیا ہے۔ میر نے غزل کا نیا آہنگ اور لب ولہجہ تخلیق کیا ہے۔ اُن کا شاعرانہ لب ولہجہ اپنے اندر بانکی اور تیکھی کیفیت رکھتا ہے۔ آپ نے زبان کے کینوس کو وسعت عطا کی ہے۔ میر کی غزل سادگی و پرکاری، رمزیت و ایمائیت، کمالِ تمثال کاری، بے مثال تشبیہ واستعارے سے آراستہ ہے۔ اُن کا تصورِ غم، حسن وعشق اور فلسفۂ حیات اُنھیں الگ رنگِ سخن اور اعتبار عطا کرتا ہے۔ انھی وجوہ کی بنا پر ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے میر زندہ جاوید شاعر قرار دیا ہے، جو دنیائے اُردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

میر تقی میر کو بیک وقت سرتاج شعرائے سخن، امام المتغزلین، خدائے سخن اور امام المتغزلین ایسے القابات سے نوازا گیا ہے۔ دنیائے شاعریِ اُردو میں میر تقی میر وہ واحد شاعر ہیں، جنھوں نے اُردو غزل میں وہ مقام اور اعتبار حاصل کیا ہے، جو اُن کے بعد آج تک کسی اور شاعر کو نصیب نہ ہو سکا۔ میر کو یہ انفرادیت اور اعزاز بھی حاصل ہے کہ اُن کی شاعرانہ عظمت کے باب میں شعری خراجِ تحسین قریباً ہر شاعر نے پیش کیا ہے۔ اس حوالے سے میر شاعرانہ عظمت کے منفرد مینار دکھائی دیتے ہیں، میر کے عہد کو اُردو شاعری کا عہدِ زریں کہا جاتا ہے۔ یقیناً عہدِ میر اُردو شاعری کی ترقی اور ارفعیت کے حوالے سے بے مثال تھا اور میر کے مقام وعظمتِ شعری کا اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ قصیدے کا بادشاہ مرزا رفیع سودا یہاں تک عظمتِ شعرِ میر کے اعتراف میں کہہ جاتے ہیں:

سوؔدا تو اس زمیں میں غزل در غزل ہی لکھ
ہونا ہے تجھے میؔر سے اُستاد کی طرح

عہدِ میؔر میں مثنوی کے بادشاہ میر حسؔن، تصوف کے بادشاہ خواجہ میر دردؔ اور نظم کی حقیقی اور عوامی طرح ڈالنے والے نظیر اکبر آبادیؔ ایسے نابغۂ روزگار شعرا اپنی اپنی سنگھاسن پر براجمان تھے اور میر تقی میؔر اُن سب میں اپنے مزاج اور شاعری کے حوالے سے منفرد دکھائی دیتے تھے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ میؔر جیسا نابغۂ روزگار شاعر اپنے عہد و حیات میں ناقدریِ زمانہ کا شکار رہے ہیں۔ میر تقی میؔر آج اُردو ادب کے کلاسیک اور ادبِ عالیہ میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ میؔر کو یہ انفرادیت اور عظمت ایسے ہی حاصل نہیں ہوئی، اس کے در پردہ محرکات میں آباؤ اجداد، خاندانی حالات، تربیت اور ان کے عہد کے سیاسی، سماجی اور ادبی حالات وغیرہ نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ میؔر شناسی کی روایت میں ان محرکات نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان محرکات وعوامل نے میر کی شاعری کو بلند مقام عطا کیا ہے۔ میؔر نے محمد شاہی عہد میں اس وقت آنکھ کھولی جب برصغیر میں ہر طرف انتشار اور افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ لہٰذا میؔر نے غربت، افلاس اور تنگ دستی میں عمرِ عزیز کو تمام کیا۔ آپ کے والد نے میر کے مزاج میں صبر وقناعت اور تسلیم ورضا کے جذبات پیدا کیے اور گرمیِ عشق سے آپ کے دل کو منور کیا۔ اس ضمن میں میؔر خود رقم طراز ہیں:

> ''۔۔۔بیٹا عشق اختیار کرو۔ عشق ہی اس کارخانے میں متصرف ہے۔ اگر عشق نہ ہوتا تو نظمِ کُل قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ بے عشق زندگی وبال ہے۔۔۔ دنیا میں جو کچھ ہے وہ عشق کا ظہور ہے۔۔۔ عشقِ الٰہی کو اپنا پیشہ کرو۔۔۔'' (۱)

میؔر نے ایسا نصیب پایا تھا کہ اُن کی کفالت کا ذمہ جس نے بھی اٹھایا وہ زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکا۔ والد کی وفات کے بعد میؔر کی زندگی میں آنے والا ہر محسن قضا کا شکار ہو گیا۔ لہٰذا میؔر کو امتدادِ زمانہ کے اپنا کفیل خود بنائے رکھا۔ میؔر کی کفالت کا ذمہ اُن کے منہ بولے چچا میر امان اللہ نے لیا۔ اُن کی وفات کے بعد نواب صمصام الدولہ نے میؔر پر نظرِ عنایت کی۔ میؔر عالمِ جنون کا شکار

ہوئے اور اپنے سوتیلے ماموں سراج الدین علی خانِ آرزو کے پاس رہے اور تھوڑے عرصے بعد وہاں سے بھی نکال دیا گیا۔ میرؔ نے اپنی مثنوی خواب وخیال میں اپنے عالمِ جنوں کا تذکرہ یوں کیا ہے:

جگر جورِ گردوں سے خوں ہو گیا
مجھے رُکتے رُکتے جنوں ہو گیا

میرؔ کے زمانے میں دہلی کے حالات بھی نہایت ابتر تھے۔ اُنھوں نے شاہِ عالم ثانی کی آنکھوں میں سلائیاں پھیرتے ہوئے دیکھیں۔ اُن کا درج ذیل شعر اسی واقعے کی طرف اشارہ ہے:

شہاں کہ کحلِ جواہر تھی خاکِ پا جن کی
انھیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ اور اندرونی امرا اور نوابین کی نالائقیوں اور ریشہ دوانیوں نے ہندوستان کے سیاسی حالات کو مزید ابتر کر دیا تھا۔ دہلی کو بار بار لوٹا جا رہا تھا۔ مسلمانوں کا اپنا اقتدار، اتحاد اور اثر اور رسوخ بری طرح متاثر ہوتا جا رہا تھا۔ چناں چہ میرؔ ان سارے حالات کے چشم دید گواہ تھے اور دہلی کی تاراج نے تو انھیں اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ کسمپرسی اور بے سروسامانی کے عالم میں گردشِ روزگار کے مارے ہوئے اپنوں اور پرائیوں کی بے رُخی اور دل کے لٹنے کی کیفیت کا کھل کر اپنی شاعری میں ذکر کرتے ہیں۔ میرؔ کے مزاج میں حالات کے مارے ہوئے چڑ چڑا پن اور بد دماغی کے آثار جنم لیتے گئے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے عہدِ میرؔ کے اس اندرونی خلفشار، باہم خانہ جنگی، لشکروں کی تباہی و بربادی، لوٹ مار اور مغلوں کی سلطنت کے پارہ پارہ ہونے کے بارے میں لکھتے ہوئے میرؔ کے دل ودماغ پر ان حالات کے اثرات کا ذکر یوں کیا ہے:

> ''اٹھارویں صدی عیسوی کے اس ماحول میں پراگندہ روزی، پراگندہ دل، بے دماغ اور انا پرست میرؔ کے علاوہ کوئی اور ہوتا تو پس کر رہ جاتا، لیکن میرؔ نے وقت کی دھڑکن کو اپنے خون میں شامل کر کے اُسے اپنی شاعری کے ساز میں سمو دیا۔ میرؔ کی آواز اٹھارویں صدی کے برصغیر کی روح کی آواز ہے، جس میں اس دور کے احساسات، امید وبیم، خوف ورجا، آس و یاس اور غم والم شامل ہیں۔ میرؔ کی شاعری ایک ایسا آئینہ ہے، جس میں ہم اس دور کی روح کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔'' (۲)

میرؔ نے انتہائی کسمپرسی کے عالم میں زندگی گزاری۔ دہلی کے تباہ شدہ احوال کے بعد میرؔ نے لکھنؤ کا رخ کیا، لیکن ناکامیاں اور محرومیاں اُن کے دامن گیر ہی رہیں۔ تھوڑے عرصے آسودہ حالی کے بعد میرؔ نے پھر اُسی طرح مالی بدحالی اور پریشانی کا سامنا کیا۔ ایسے حالات میں میرؔ کی جذباتی حالت اور گردوپیش کی فضا میرؔ کے غموں میں اضافے کا سامان کرتی رہی۔ سچ ہے کہ اچھا ادب بالخصوص اچھی شاعری عموماً بُرے حالات ہی میں تخلیق ہوا کرتی ہے۔ میرؔ ایسے شخص کی بد دماغی اور کوڑھ مغزی کے اسباب نے اس سے ایسے ایسے نشتر اشعار کہلوائے ہیں، جن میں جذبے اور احساس کی کارفرمائی نے میرؔ کی شاعری کو امر کر دیا ہے۔ میرؔ کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے نامساعد حالات کے باوجود انانیت کو برقرار رکھا:

میرے تغیرِ حال پر مت جا
اتفاقات ہیں زمانے کے

حالِ بدگفتنی نہیں مرا
تم نے پوچھا تو مہربانی کی

لکھنؤ کے نواب آصف الدولہ کے پاس گزرنے والا میؔر کا عہد آسودہ حال تھا۔ آصف الدولہ نے میؔر کے معاملے میں فیاضی اور دریا دلی کا مظاہرہ کیا۔ نواب کی عیش کوشی اور عیاشی میں ہر طائفہ انسانی کے بڑے لوگ حتیٰ کہ انگریز بھی شامل ہوتے تھے۔ میؔر مزاجاً اس آرائش و تکلف کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ معاشی فراغت کے باوجود لکھنؤ میں خود کو دہلی کے مقابلے میں اُس طرح نہ ڈھال سکے۔ چناں چہ لکھنؤ کا قیام میؔر کے لیے آہنی آزردہ حالی پر مبنی رہا۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ نامساعد حالات کے باوجود میؔر دہلی میں شاعرانہ عظمت کا لوہا منواتے ہوئے بام کو چھو چکے تھے۔ میؔر کو اپنی شاعری اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ لکھنؤ کی آسودہ حالی کے مقابلے میں وہ دہلی کی بے آرامی اور خطر پسندی کو ترجیح دیتے تھے۔ اُن کے ہاں دل اور دلّی کا استعارہ اسی جذبے کا عکاس ہے۔ دل اور دلّی کے لٹنے کی کیفیت میؔر کی شاعری میں عجب سوز اور کرب کا سامان پیدا کرتی ہے:

دلّی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے
جو شکل نظر آئی ، تصویر نظر آئی

یہی وجہ ہے کہ میؔر معاشی آسودہ حالی اور فراغت کے باوجود لکھنؤ پر دہلی کو ہمیشہ ترجیح دیتے رہے۔ اس میں بھی میؔر عجب لطف کشید کرتے تھے۔ لکھنؤ کے مقابلے میں میؔر کی دہلی پسندی کے ضمن میں چند شعری مثالیں دیکھیے:

یا رب شہر اپنا چھڑایا تو نے
ویرانے میں مجھ کو لا بٹھایا تو نے
میں اور کہاں لکھنؤ کی یہ خلقت
اے وائے یہ کیا کیا خُدایا تو نے

---

خرابہ دلّی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا
وہیں میں کاش مرجاتا سراسیمہ نہ آتا یاں

---

آباد اجڑا لکھنؤ چغدوں سے اب ہوا
مشکل ہے اس خرابے میں آدم کی بود و باش

لکھنؤ کی رونق اور عیش کوش فضا کے باوجود میر دلّی ہی میں سانسیں لیتے اور اس کے گیت گاتے نظر آتے ہیں۔ لکھنؤ اُن کے لیے دیارِ غیر ہی رہا اور وہ اس خرابے میں خود کی بے زبانی کا تذکرہ کرتے رہے ہیں۔ اس حوالے سے میؔر کا یہ شعر دیدنی ہے:

کس کس ادا سے ریختے میں نے کہے ولے
سمجھا نہ کوئی میری زباں اس دیار میں

پورب کے باسیوں کی معاشرت میؔر کو کب راس آسکتی تھی۔ وہ داخلی طور پر اُس خارجی ماحول کو کسی طرح پسند نہ کر سکے، جس نے اُن کی شاعری میں ایک اور رنگ پید کر دیا۔ میؔر کے لیے لکھنؤی معاشرہ اور گھٹن زدہ اور یبوست زدہ لگ رہا تھا۔ لکھنؤی تہذیب و معاشرت کی جعلی رنگ آمیزی میؔر کے لیے ذہنی خلفشار بن رہی تھی۔ لکھنؤ کی ظاہری چکا چوند روشنی میؔر کے

داخل کے لیے سوہانِ روح ثابت ہو رہی تھی۔ غرض لکھنؤ میں میرؔ کی شاعری ذریعۂ معاش بن کر رہ چکی تھی، جس میں دہلوی رنگ اور میرؔ کا اصل رنگِ سخن بالکل مفقود تھا۔ گویا دہلی کے میرؔ کے مقابلے میں لکھنؤ کا میرؔ ایک اور رنگ میں گویا تھا۔ علی سردار جعفری اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''میرؔ کا مزاج اس فضا سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتا تھا۔ اُن کی عمر کے آخری بیس تیس سال میرؔ کے معیار کی غزل فراہم نہ کر سکے زیادہ وہ آصف الدولہ کے لیے شکارنامے اور مثنویاں لکھتے رہے۔ وہ اپنی عظمت کی آخری بلندیاں دہلی میں چھوڑ چکے تھے۔ لکھنؤ رفعتِ پرواز کے لیے کوئی بلند آسماں نہ دے سکا۔'' (۳)

میرؔ نے اپنے والد کی تلقین پر عشق شعار کیا تھا۔ اسی جذبے کے زیرِ اثر میرؔ نے انسانی زندگی کی حقیقتوں کو بڑے قریب سے دیکھا تھا۔ وہ اسی جذبے کے اثر سے فرد اور معاشرے کے ربط و تعلق اور انسانی رشتوں کی سراغ رسانی کرتے ہیں۔ اُن کی شاعری کا مرکزی دائرہ دل اور عشق کے گرد گھومتا ہے۔ عشق و محبت کے مضامین کو میرؔ نے غزل کے ساتھ مثنویوں میں بھی بڑی شد و مد سے بیان کیا ہے۔ عشق وہی جذبہ ہے، جس نے میرؔ کی شخصیت اور سیرت کی بُنت کی ہے، جس پر تصوف کے اثرات کے مشاطگی کا فریضہ انجام دیا۔ اگرچہ تصوف کے مضامین کے بیان میں میرؔ، دردؔ نہ بن سکے، لیکن میرؔ کی تصوف کی نامکمل اور ادھوری تعلیم نے شعر گفتنی میں اہم کردار ادا کیا۔ میرؔ اپنے عہد کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی رویوں اور ماحول کے چشم دید گواہ تھے۔ انھوں نے اپنے دور کی سیاسی اور سماجی آویزشوں کو بہت قریب سے دیکھا تھا، جس کا واضح عکس اُن کی شاعری میں جھلکتا ہے۔ چناں چہ عشق محبت کے مضامین کے ساتھ غم والم کے مضامین میرؔ کی شاعری کا اثاثہ رہے ہیں۔ اس ضمن میں دواوینِ میرؔ سے چند اشعار بطورِ مثال ملاحظہ ہوں:

جہاں سے دیکھیے یک شعر شور انگیز نکلے ہے
قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہر جا میرے دیوان میں

---

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر تو سو مرتبہ لوٹا گیا

---

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہے گویا چراغ مفلس کا

---

ہے اس طرح دلِ ویراں میں داغ ایک
اُجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک

---

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اُجاڑ کر

کر ذکر کر آسودگی کا مجھ سے اے ناصح
وہ میں ہی ہوں کہ جس کو عافیت بیزار کہتے ہیں

---

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

میؔر کا تصورِ غم اُن کی شاعری میں جا بجا جلوہ گر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میؔر کا عہد داخلی اور خارجی انتشار اور طوائف الملوکی سے مملو تھا۔ مغلیہ حکومت کا اپنی مرکزیت کھونا، صوبوں کی خودمختاری کے اعلانات، نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے پے در پے حملوں اور دہلی کی غارت گری کی بدولت اجتماعی کرب اور دکھ کی کیفیت، ناقدریِ زمانہ، میؔر کی بددماغی اور الم پرستی ایسے حالات میؔر کی شاعری کا اثاثہ رہے ہیں۔ میؔر کے ہاں غزلِ غم کے ان عناصر کا منظر نامہ پیش کر رہی ہے، جس میں میؔر کا ذاتی اور کائناتی غم آفاقی اقدار کے ساتھ جھلکتا ہے۔ یہ کہنا بجا ہوگا کہ میؔر ایسے نابغۂ روزگار شاعر نے ذاتی غم والم کو اجتماعی کرب سے آمیخت کرتے ہوئے زندگی کے جذبوں کو ہمہ گیریت عطا کی ہے۔

جہاں تک میؔر کے فن اور اسلوب کی تازہ کاری اور انفرادیت کا تعلق ہے، اس کے در پردہ کئی شعری محاسن اور کلام کا لطف و اثر کارفرما ہے۔ اُن کے اشعار میں حسن و دل کشی اور عظمت و رفعت نو بہ نو انداز میں جھلکتے ہیں۔ میؔر کا نادرہ کار اسلوب اس پر مستزاد ہے۔ اُن کی استعمال کردہ شعری زبان ایک نو بہار چشمے کا اثر رکھتی ہے، جس سے منفرد انداز میں نت نئے مضامین پھوٹتے ہیں۔ اُنھوں نے ایسی شستہ اور برجستہ زبان استعمال کی ہے، جس نے اُردو کی تشکیل و ترویج میں مؤثر کردار ادا کیا ہے۔ اُن کے ہاں اہلِ دلی کے محاورے سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے جامع مسجد کی سیڑھیوں والی استاذی زبان کے استعمال سے عوامی گفتگو کی ہے، اسی لیے میؔر نے کہا ہے:

شعر میرے ہیں سب خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

میؔر نے بڑی فن کاری سے وارداتِ قلبی کو عوام کے شعور کا حصہ بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی دلی اور باطنی کیفیات کو مانوس اور عام بول چال کے الفاظ میں بیان کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ اُن کے کلام میں اثر آفرینی انتہا کو پہنچتی نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاثیرِ کلام میؔر کے بارے میں درست لکھا ہے:

> ''میر کے اشعار کے معنی سمجھے بغیر ہم اُن کا اثر قبول کر لیتے ہیں۔ میؔر کے اشعار کا اثر قاری تک پہلے پہنچتا ہے اور معنی بعد میں۔''(۴)

میؔر نے کمال ہنروری سے تخلیقی عمل سے اپنے افکار و تخیلات کو جذبے اور احساس میں سمو کر پرکاری سے بیان کیا ہے۔ ان کے کلام میں پائی جانے والی اثر انگیزی عدیم المثال ہے۔ اُن کا شاعرانہ لہجہ اپنے اندر بیک وقت تلخی، شیرینی اور لوچ رکھتا ہے۔ وہ انفرادی آہنگ اور لے کی وجہ سے معاصر شعرا میں الگ تھلگ پہچان رکھتے ہیں۔ انسانی جذبات کو شعری پیکر میں ڈھالنے کا کمال ہنر میؔر کو انفرادیت بخشتا ہے۔ میؔر کے ہاں فارسی الفاظ و تراکیب کا استعمال اور مشکل و نامانوس الفاظ بھی دیگر شعرا کی طرح غیریت کا گمان نہیں رکھتے۔ میؔر لفظوں کو اپنے کلام میں نگینوں کی طرح جڑتے ہوئے اعتبار عطا کرتے ہیں۔ عوامی لہجے

کے باوجود میرؔ کے کلام کو خواص کی پسندیدگی اور پذیرائی حاصل رہی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، میرؔ کے لہجے اور کلام کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''میرؔ نے ایسے مضامین بھی بکثرت منظوم کیے ہیں، جو طبعِ انسانی کے قریب ہیں اور ایسے انداز سے باندھا ہے، جو مانوس اور فطری ہے، لہجۂ عام کی پیروی کے طفیل میرؔ کا کلام عام پسند ہوا۔ میرؔ خیالات کو سادہ اور عام زبان میں پیش کرتے ہیں۔ دقت اور اغلاق سے عموماً گریز کرتے ہیں۔''(۵)

میرؔ نے بڑے سلیقے اور عمدگی سے فارسی الفاظ و تراکیب کو مناسب روزمرے کے روپ میں شعری سانچے میں ڈھالا ہے۔ میرؔ نے اُردو زبان کو فنی کینوس عطا کرتے ہوئے وسعت آشنائی کا سامان کیا ہے۔ اُن کے ہاں محاورے کی چاشنی بھرپور انداز لیے ہوئے ہے۔ وہ لفظوں کے حقیقی پارکھ اور نبض شناس واقع ہوئے تھے۔ اس لیے موقع و محل کی نزاکتوں کے عین مطابق لفظوں کو جذبے اور تاثیر کے مطابق ڈھالنے کا ہنر جانتے تھے۔ میرؔ نے اپنی شاعری کے ذریعے زبان کی آرائش کا سامان بھی کیا ہے۔ لفظ تو جیسے میرؔ کے سامنے دست بستہ دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے تو لفظوں کے ذریعے مترنم کیفیت پیدا کی ہے۔ لفظوں کے بَل پر زبان کی تراش خراش اور آرائش کا سامان میرؔ ایسا شاعر ہی کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرؔ کے ہاں روزمرہ زبان شعری پیکر کی تراشیدگی کا ذریعہ بنتی ہے۔ میرؔ کی شاعری میں استعمال ہونے والی جامع مسجد کی سیڑھیوں والی اور روزمرہ کی زبان کے استعمال کے بارے میں ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

> ''میرؔ واحد شاعر ہیں، جنھوں نے ہماری زبان کے فطری اور نامیاتی عناصر کو اہمیت دی اور اظہارِ مطلب کی سعی میں مناسب الفاظ کو اختیار کیا۔''(۶)

میرؔ نے اپنی شاعری میں روزمرہ کا برملا اور بے ساختہ استعمال کیا ہے۔ اُنھوں نے ابلاغ کے لیے روزمرہ اپنے اشعار کی زینت بنایا نہ کہ روزمرے کی لیے شاعری کی۔ لفظوں کو چنا اور نگینوں کی طرح شعری پیکر میں ڈھالنا میرؔ کے بائیں ہاتھ کا کھیل رہا ہے۔ اُن کے ہاں آمد ہی آمد ہے اور بقول مولانا حالیؔ تفحص الفاظ اپنا سماں باندھ لیتے ہیں:

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا
پڑھتے کسو کو سنیے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا

---

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

---

بعد ہمارے اس فن کا جو کوئی ماہر ہووے گا
درد آگیں انداز کی باتیں اکثر پڑھ پڑھ رووے گا

---

دور بہت بھاگو ہو ہم سے سیکھے طریق غزالوں کا
وحشت کرنا شیوہ ہے کیا اچھی آنکھوں والوں کا

دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش
گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا

میؔر نے اپنے کلام میں شستہ اور رواں زبان استعمال کی ہے۔ انھوں نے عوام سے اشعار میں ایسے انداز میں باتیں کی ہیں، جنھیں خواص کے ہاں بھی قبولِ عام حاصل رہا ہے۔ میؔر کے بعد مغلیہ عہد میں اُن کے ریختوں کو عوامی حیثیت حاصل رہی اور وہ عام بول چال میں اُن کے اشعار پڑھتے رہے۔ اُردو کے نامور شعرا کے ہاں زبان کا ایسا مزا اور چٹخارہ کہیں نہیں ملتا۔ انھوں نے ایسے اچھوتے انداز میں وارداتِ قلبی کا اظہار کیا ہے کہ اُن کے جذبے اور احساس کے ساتھ صاف ستھری اور نکھری ہوئی زبان الگ طور پر مزا دیتی ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے اس ضمن میں لکھا ہے:

> ''میر صاحب کی زبان شستہ، کلام صاف، بیان ایسا پاکیزہ جیسے باتیں کرتے ہیں۔ دل کے خیالات کو جو کہ سب کی طبیعتوں کے مطابق ہیں، محاورے کا رنگ دے کر باتوں باتوں میں ادا کر دیتے ہیں۔'' (۷)

طرزِ میؔر سادہ ہونے کے باوجود پُر کار ہے۔ انھوں نے ایسا طرز ایجاد کیا ہے، جس کے وہ موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔ انھوں نے ایسے ایسے نشتر اشعار نکالے ہیں، جو اپنی پہچان، زبان زدِ عام اور سہل ممتنع کی نادر اور عمدہ مثالیں ہیں۔ جذبے اور احساس کی کارفرمائی کے ساتھ ایجاز واختصار اور معنوی اثر خیزی کے باب میں ایسے اشعار اپنی مثال آپ رکھتے ہیں۔ لفظوں میں جہان بینی کی تخلیق اور دریا کو کوزے میں بند کرنے کا سماں باندھنا میؔر کا خاصہ رہا ہے۔ اُن کے کلام میں رمز وایمائیت چونکا دینے والی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ اجمال میں تفصیل کا رنگ میؔر کے کلام کا اعجاز ہے۔ مضمون میں نرم وملائم اور مترنم الفاظ سے دل موہ لینے والی کیفیتِ تاثر پذیر کا منظر پیدا کرتی ہے۔

میؔر نے تمثال کاری کے میدان میں بھی انفرادیت قائم رکھی ہے۔ وہ لفظوں سے چلتی پھرتی اور جیتی جاگتی تصویریں بنانے پر قدرت رکھتے ہیں۔ میؔر نے تشبیہ اور استعارے کے ذریعے منظر کو جیتا جاگتا روپ عطا کیا ہے۔ صنائع وبدائع کے حسین التزام نے اُن کے کلام میں عجب رنگ ڈھنگ پیدا کیا ہے۔ اُن کے تجربات ومشاہدات جذبے کی صداقت کے عکاس ہیں۔ تخلیقی جوہر سے دل کے نہاں خانوں میں موجود عشقیہ ارتعاش پیدا کرنا اور فنی شاعری کے ممکنہ لوازم سے عہدہ برآ ہونا میؔر ایسے ماہرِ فن کار کا کام ہوسکتا ہے۔ مختصر لفظوں میں بڑے سے بڑا مضمون سمونا اور جہانِ معنی کی پیدا کاری سخنِ میر کا اختصاصی عنصر رہا ہے۔ مترنم اور کومل الفاظ کا چناؤ، عروض وآہنگ اور مترنم لے کے ساتھ طویل اور مختص بحور کا استعمال میؔر کی جذباتی کیفیت، عشقیہ واردات اور فنی کمال کی اہم دلیل ہے۔ میؔر نے چھوٹی بحور کے استعمال والی غزلوں میں جذبے کی شدت کو کمالِ فن کاری سے شاعری کی تخلیقی حیثیت سے روشناس کروایا ہے۔ اسی جذبے کی شدت کے اظہار کے حوالے سے محمد حسن عسکری کہتے ہیں:

> ''میر چھوٹی بحروں میں کوشش کرتے ہیں کہ ساری زندگی کا جوہر نچوڑ لیں۔ اس زندگی کا جو صرف ان کی نہیں بل کہ سبھی کے تجربے میں آتی ہے۔'' (۸)

مترنم لفظی انتخاب اور مختصر بحور کے استعمال سے پیدا شدہ غنائیت کے حوالے سے کلامِ میؔر سے چند شعری مثالیں دیکھیے:

آج کے بے قرار ہیں ہم بھی
بیٹھ جا چلنے ہار ہیں ہم بھی

---

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

---

سخت کافر تھا، جن نے پہلے
مذہبِ عشق اختیار کیا

---

ہم فقیروں سے بے ادائی کیا
آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

---

جن بلاؤں کو میؔر سنتے تھے
ان کو اس روزگار میں دیکھا

---

اب تو جاتے ہیں بت کدے سے میؔر
پھر ملیں گے گر خدا لایا

---

دیکھ سیلاب اس بیابان کا
کیسا سر کو جھکائے جاتا ہے

## حوالہ جات


۱۔ میرتقی میر، ذکرِ میر، مرتب و مترجم: ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، لاہور: مجلس ترقیِ ادب، ۱۹۹۶ء، ص:۱۷۸
۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، میر تقی میر، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۳ء، ص:۳۳
۳۔ علی سردار جعفری، پیغمبرانِ سخن، لاہور: مکتبہ اُردو ادب، س ن، ص:۱۰۳
۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، میر تقی میر، ص:۹۴
۵۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر، نقدِ میر، لاہور: مکتبہ خیابانِ اُردو ادب، ۱۹۶۸ء، ص:۴۷
۶۔ شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر، شعرِ شورانگیز، جلد اول، دہلی: ترقی اُردو بیورو، ۱۹۹۰ء، ص:۷۹
۷۔ آزاد، محمد حسین، مولانا، آبِ حیات، لاہور: عشرت پبلشنگ ہاؤس، س ن، ص:۱۸۷
۸۔ محمد حسن عسکری، ستارہ یا بادبان، کراچی: مکتبہ سات رنگ، ۱۹۶۳ء، ص:۲۱۲


☆......☆......☆